ہمارے شعروں میں مقتل کے استعارے ہیں
ہماری غزلوں نے دیکھا ہے کوچۂ قاتل
صلیب و دار پہ نظمیں ہماری لٹکی ہیں
ہماری فکر ہے زخمی، لہو لہان ہے دل
ہر ایک لفظ پریشاں، ہر ایک مصرعہ اُداس
ہم اپنے شعروں کے مفہوم پر پشیماں ہیں

ملک زادہ منظور احمد

شہرِ ستم

(انتخابِ کلام)

ملک زادہ منظور احمد

کتاب ______ شہرِ ستم

مُصنّف ______ مَلک زادہ منظور احمد

ترتیب ______ (ڈاکٹر) نیّر مسعود

خطّاط ______ محمّد الیاس

مطبع ______ ایرانین آرٹ پرنٹرز دہلی

طبع اوّل ______ ایک ہزار

سالِ اشاعت ______

قیمت ______

ملنے کے پتے:

- دانش محل ______ امین آباد، لکھنؤ
- نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین الدولہ پارک، لکھنؤ
- شہرِ ادب۔ سی۔ ۱۳۲۹۔ اندرا نگر لکھنؤ ۱۶

یہ کتاب

اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی

اکاڈمی کا مندرجات سے متفق ہونا ضروری نہیں

شہرِ ستم

فہرست

دیباچہ

ملک زادہ منظور احمد اعلیٰ درجے کے شاعر، بے مثال مقرر، اور قابلِ اعتماد دانشور ہیں، لیکن مشاعروں کی نظامت کے فن کو اُنھوں نے اس بلندی پر پہنچا دیا ہے کہ تمام ذہنوں میں ان کی تصویر نظامت ہی کے انداز میں اُبھرتی ہے۔ اس نظامت کے فن سے اُن کو خود اور اردو مشاعروں کو جو بھی فائدہ پہنچا ہو لیکن ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ ملک زادہ سب شاعروں کا تعارف کراتے ہیں اور خود ان کے تعارف کرانے کے لئے کوئی مناسب صورت پیدا نہیں ہو پاتی اور پھر پانچ چھ گھنٹوں کے طویل مشاعرے میں ان کی تقریر کے آبشار کے نیچے ان کی شاعری کی تُنک اور لطیف نغمہ ریزی گم ہو کر رہ جاتی ہے اس لئے ان کے شعری مجموعے کی اشاعت ایک مبارک بات ہے۔

کتاب کا نام "شہرِ ستم" بہت بلیغ ہے، اس کی معنویت شہر و دیار سے لے کر جسم و جان تک محسوس کی جا سکتی ہے۔ ہر معاصر اس پر شاہد ہے کہ ہم ایک بے ضمیر اور بے حیا دورِ تاریخ سے گذر رہے ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں صرف شاعر کی آواز روشنی کی ایک کرن ہے جو زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ اقدار کی شکست و ریخت کے بعد اپنی شاعری میں اس المئے کا جشن منانا ایک طرح کی کلبیت ہے جس کا اظہار کچھ شعراء نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے اور وہ یہ محسوس کرنے سے قاصر ہیں کہ یہ زندگی کی آخری حقیقت نہیں ہے، یہ بہتے ہوئے دریا کی وہ موج ہے جو اُبھرنے کے لئے ڈوبی ہے۔ ایسے سفاک عہد میں شاعر کا سب سے بڑا اہم کام اپنی داخلی ترنم ریزی کو زندہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے۔ ملک زادہ منظور احمد کا یہی سب سے بڑا کارنامہ ہے

اس کے ساتھ ان میں اس عہد سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی ہے ؂

تار ہے باقی متاعِ سوز و سازِ زندگی
عاشقی میں ایک رقیبِ روسیہ پیدا کرو
گُل گریباں چاک، غنچے مضمحل، بُلبُل اُداس
ایسی تعبیروں سے اپنے خواب مت رُسوا کرو
آج سبھی کے ہاتھوں میں ہے سنگِ بے حسی
اپنا غم کہنے سے پہلے دیر تک سوچا کرو

ان کے سارے الفاظ اور استعارے جانے پہچانے ہیں لیکن ان کے استعمال میں ایک نُدرت اور تازگی ہے۔ خوف جو آج کی شاعری کا ایک اہم موضوع بن گیا ہے۔ ملک زادہ کے اشعار میں بھی جھلکتا ہے لیکن ان کو پڑھ کر دل پر خوف طاری نہیں ہوتا بلکہ ایک لطیف احساس بن جاتا ہے یہ ان کے کلاسیکی ریاض کا اثر ہے اور غالب کی عطا کی ہوئی میراث ہے ؂

نہ خوفِ برق نہ خوفِ شرر لگے ہے مجھے
خود اپنے باغ کے پھولوں سے ڈر لگے ہے مجھے

دل کا ہر قطرۂ خوں رنگِ حنا سے مانگو
خوں بہا دوستو قاتل کی ادا سے مانگو

لیکن کبھی کبھی اقبال جاگ اٹھتا ہے، آخر یہ بھی تو ہماری نہایت قیمتی میراث ہے ؂

مت بناؤ یدِ بیضا کو گدا کا کشکول
وقتِ فرعون ہو جب ضربِ عصا سے مانگو

ملک زادہ منظور احمد کی شعری تربیت کلاسیکی ہے اور ان کا ذوق آج کے عہد کی

رومانیت سے بھی آشنا ہے ان دونوں کیفیات کا امتزاج چھوٹی چھوٹی خوب صورت غزلوں کی شکل میں نمایاں ہوا ہے۔ میں اس مختصر سے دیباچے کو چار اشعار کی ایک غزل پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔

ضیائے صبح بھی ہے دامنِ صبا بھی ہے
سوال یہ ہے کہ غنچہ کوئی کھلا بھی ہے
تمازتِ غمِ دوراں سے وہ بھی بچ نہ سکے
کہ جن کے شانوں پہ زلفوں کی اک گھٹا بھی ہے
وداع ہوش ہی عنوانِ فصلِ گل تو نہیں
چمن میں چاک گلوں کی حسیں قبا بھی ہے
اس التفاتِ فراواں کو کیا کہوں منظورؔ
نگاہِ لطف بھی ہے نشترِ جفا بھی ہے

کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ "شعر مرا مدرسے کے بُرد" (میرے اشعار کو مدرسے کس نے پہنچایا؟) کیونکہ مدرسے کے مُلّا تنگ نظر ہوتے تھے آج کی درس گاہیں دانش کدے ہیں اور تنگ نظر مُلّا نہیں بلکہ روشن خیال اساتذہ کی اقامت گاہیں ہیں اس لئے وہاں شعروں کے چشمے بھی اُبل رہے ہیں۔

ملک زادہ منظور احمد لکھنؤ یونی ورسٹی میں اُردو کے استاد رہ چکے ہیں اور ملک بھر میں اُردو کی تحریکوں سے وابستہ رہے ہیں۔ علم و دانش اور روشن خیالی ان کی ذات کا ایک حصہ ہے۔

علی سردار جعفری
۲۰ اپریل ۱۹۹۱ء

۱۰۔ سیتا محل
بومن جی پیٹٹ روڈ، بمبئے

*

اِبتدائیہ

ہمارے شعروں میں مقتل کے استعارے ہیں
ہماری غزلوں نے دیکھا ہے کوچۂ قاتل
صلیب و دار پہ نظمیں ہماری لٹکی ہیں
ہماری فکر ہے زخمی، لہو لہان ہے دِل
ہر ایک لفظ پریشاں، ہر ایک مصرعہ اُداس
ہم اپنے شعروں کے مفہوم پر پشیماں ہیں

خدا کرے کہ جو آئیں ہمارے بعد وہ لوگ
ہمارے فن کی علامات کو سمجھ نہ سکیں
چراغ دیر و حرم سے کسی کا گھر نہ جلے
نہ کوئی پھر سے روایاتِ رفتگاں لکھے
نہ کوئی پھر سے علاماتِ خونچکاں لکھے

فصیلِ دار، سروں کے چراغ، رقصِ جنوں
سراب، تشنہ لبی، خسار، آبلہ پائی
دریدہ پیرہنی، چاک دامنی، وحشت
سموم، آتشِ گل، برق، آشیاں، صیاد
روایتیں یہ مرے عہد کی امانت ہیں
علامتیں یہ مرے شعر کا مقدر ہیں

خدا کرے کہ جو آئیں ہمارے بعد وہ لوگ
ہمارے فن کی علامات کو سمجھ نہ سکیں
چراغ دیر و حرم سے کسی کا گھر نہ جلے
نہ کوئی پھر سے روایاتِ رفتگاں لکھے
نہ کوئی پھر سے علاماتِ خونچکاں لکھے

کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں، دونوں میری ذات کے نام
ایک غزل منسوب ہے اُس سے، ایک غزل حالات کے نام

موجِ بلا دیوارِ شہر پہ اب تک جو کچھ لکھتی رہی
میری کتابِ زیست کو پڑھیے، درج ہیں سب صدمات کے نام

گرتے خیمے، جلتی طنابیں، آگ کا دریا، خُون کی نہر
ایسے منظم منصوبوں کو دُوں کیسے آفات کے نام

اُس کی گلی سے مقتلِ جاں تک، مسجد سے میخانے تک
اُلجھن، پیاس، خلش، تنہائی، کربِ زدہ لمحات کے نام

صحرا، زنداں، طوق، سلاسل، آتش، زہر اور دار و رسن
کیا کیا ہم نے دے رکھے ہیں اپنے احسانات کے نام

روشن چہرہ، بھیگی زُلفیں، دُوں کس کو کس پر ترجیح
ایک قصیدہ دُھوپ کا لکھّوں، ایک غزل برسات کے نام

جن کے لئے مر مر کے جئے ہم، کیا پایا اُن سے منظور
کچھ رُسوائی، کچھ بدنامی، ہم کو ملی سوغات کے نام

ایک شام

یہ شامِ غم کا اندھیرا، اُداس تنہائی
تصوّرات میں اک شمع بھی نہیں جلتی
نگاہِ ناز کا جادو نہ زُلف کا سایا
شمیمِ وعدۂ فردا، نہ بُوئے پیراہن
بُجھے بُجھے ہیں دیئے ہر طرف اُمیدوں کے
سکوتِ شامِ الَم ہے کہ بڑھتا جاتا ہے

حیات کاسۂ دریوزہ گر اُٹھائے ہوئے
اندھیری راہوں پہ ہر سمت لڑکھڑاتی ہے
صدائیں دیتی ہے دشتِ جنوں میں گھبرا کر
مگر خود اپنی ہی آوازِ بازگشت کے ساتھ
اُلجھ اُلجھ کے اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے

سیاہ پردۂ شب ہے سیہ رُخِ مہتاب
سیاہ گنبدِ گردُوں سیاہ انجمِ شب
سیاہ جادۂ منزل، سیاہ سنگِ میل
سیاہ خار سیہ گل سیاہ برگ و شجر
سیاہیوں میں اُبھرتے ہیں موت کے سائے
سیاہ ناگ لئے اپنی آستینوں میں
گلے لگاتے ہیں لیکن صلیب کے مانند
سیاہ زہر سے پُر ہے حیات کا کشکول

سیاہ رات کے دامن میں اور کیا ہوگا
طلسمِ نیم شبی ہے کہ بڑھتا جاتا ہے

صحنِ گلشن میں چلی ایسی ہوا اَب کے برس
گُل تو گُل چاک ہے گُلچیں کی قبا اَب کے برس

جادۂ زیست کے ہر موڑ پہ جی ڈرتا ہے
اُلجھی اُلجھی سی ہے وہ زُلفِ دوتا اَب کے برس

ہم رفو کر بھی گئے دامنِ صد چاکِ جنوں
چاک در چاک ہے خود ان کی قبا اب کے برس

مژدہ اے شوقِ شہادت کہ سُنا ہے مَیں نے
تیغِ قاتل میں فزوں تر ہے جِلا اب کے برس

گر کسی رِند پہ میخانہ کا در بند ہُوا
آگ برسائے گی ساون کی گھٹا اب کے برس

سُرخیِ خونِ شہیدانِ وفا سے منظور
اور بھی شوخ ہُوا رنگِ حِنا اب کے برس

*

گذرا ہے کون عطر فشاں، کچھ جواب دو
دِل ہے اسیرِ وہم و گماں، کچھ جواب دو

کیوں تشنہ کام اَب بھی ہیں رِندانِ باصفا
سَیراب جب ہے پیرِ مغاں، کچھ جواب دو

گلشن میں تار تار ہے کیوں گُل کا پیرہن
کب تک چلے گی بادِ خزاں، کچھ جواب دو

پروانہ جل مرا تو یہ اُس کا قصور تھا
پھر شمع کیوں ہے گریہ کناں، کچھ جواب دو

چارہ گرانِ دہر مسیحا نفس ہیں جب
کیوں ڈوبتی ہے نبضِ جہاں، کچھ جواب دو

اُلجھے ہوئے ہیں آج بھی کیوں گیسوئے حیات
آشفتگانِ زُلفِ بُتاں، کچھ جواب دو

باقی ہے کتنی رات ستارو تمہیں کہو!
کب تک جلے گا قلبِ تپاں، کچھ جواب دو

منظور ہے حیات کی تفسیر شعر میں
لائیں کہاں سے لُطفِ زباں، کچھ جواب دو

*

میں

ہُوں وہ فن کار کہ تخئیل کے آئینے میں
حُسنِ افکار کے سو رنگ بھرے ہیں مَیں نے
حُسن کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا
اپنے ہی عشق پہ الزام دھرے ہیں مَیں نے

گر کبھی جانبِ میخانہ گئے میرے قدم
تلخیٔ زیست بھی شامِل رہی پیمانے میں
تشنگیٔ لبِ جمہور سے غافِل نہ ہُوا
نہ تو مےخانہ کے باہر نہ تو میخانے میں

حسن نے میرے لئے جب بھی بکھیرے گیسو
میری نظروں میں پھری کاکلِ گیتی کی شکن
قد و گیسو سے اُٹھا دار و رسن کا فتنہ
غمِ جاناں نے سکھائے غمِ دوراں کے چلن

گر کبھی حسن کی جاگی ہے زلیخا نفسی
کھینچ کر بیٹھ گیا اُسوۂ یوسف کا حصار
چاکِ داماں جو ہوا تھا اُسی پیراہن کی
بوئے عفت سے میں لایا رُخِ فردا پہ نکھار

جادۂ زیست کے ہر موڑ پہ تاریکی میں
حسن آیا ہے لیے دستِ حنائی میں چراغ
زلف نے کھول دیئے فتح و ظفر کے پرچم
دیدۂ شوخ نے بتلا دیا منزل کا سراغ

لاکھ آوارۂ گیسو و شہیدِ رخسار
وقت پڑنے پہ بڑا کام کیا ہے میں نے
نبضِ دوراں میں جو دوڑا کبھی زہرابِ جنوں
بن کے سقراط اسے ہنس کے پیا ہے میں نے

نجد کے ذرّے میں شاید جو بڑھا جوشِ جنوں
لیلیٰ و قیس کے افسانے بنائے میں نے
گر کبھی میں نے جلائی ہے یقیں کی قندیل
نارِ نمرود میں بھی پھول کھلائے میں نے

میرے افکار کی لے بانگِ درا بانگِ جرس
میرے انفاس کی خوشبو رُخِ دوراں کا سنگار
کبھی اشکوں سے بجھایا ہے کبھی آہوں سے
گردشِ وقت کے دامن سے اُڑے جب بھی شرار

*

قصّۂ مہر و وفا ۔ وہم و گماں نِکلا ہے
دوست سمجھے تھے جسے، دشمنِ جاں نِکلا ہے

جب کبھی حُسنِ یقیں حُسنِ گُماں نِکلا ہے
شمعِ فانوسِ محبّت سے دُھواں نِکلا ہے

کوہ و صحرا سے کہو، اہلِ جنوں آتے ہیں
حوصلہ دل کا ابھی ان کے کہاں نکلا ہے

سر ہتھیلی پہ لئے کوچۂ قاتل میں چلو
قرعۂ فال بہر پیر و جواں نکلا ہے

*

شمع کی طرح شبِ غم میں پگھلتے رہیے
صبح ہو جائے گی جلتے ہیں تو جلتے رہیے

وقت چلتا ہے اُڑاتا ہُوا لمحات کی گرد
پیرہنِ فکر کا ہر روز بدلتے رہیے

آئی منزل تو قدم آپ ہی رُک جائینگے
زیست کو راہِ سفر جان کے چلتے رہیے

وادیٔ شوق میں آیا ہے ہوس کا سیلاب
شمعِ کردار نہ بجھ جائے سنبھلتے رہیے

اور بڑھ جائے گا کچھ نشّۂ صہبائے حیات
چشمِ ساقی کے حسیں جام میں ڈھلتے رہیے

آئینہ سامنے آئے گا تو سچ بولے گا
آپ چہرے جو بدلتے ہیں، بدلتے رہیے

صبح ہو جائے گی ہاتھ آ نہ سکے گا مہتاب
آپ اگر خواب میں چلتے ہیں تو چلتے رہیے

عہدِ امروز ہو یا وعدۂ فردا منظورؔ
ٹوٹنے والے کھلونے ہیں بہلتے رہیے

*

ذہن میں چراغاں ہے، رُوح جگمگائی ہے
شام کے دُھندلکوں میں، یاد تیری آئی ہے

کل خزاں میں دیوانے، بے نیازِ دامن تھے
فکرِ پیرہن اب ہے، جب بہار آئی ہے

خود اُلجھ گئے آخر، جو چلے تھے سُلجھانے
گیسوئے پریشاں سے، وہ شکست کھائی ہے

ظلمتِ شبِ غم میں، زندگی کی راہوں پر
شمعِ آرزو ہم نے، مدّتوں جلائی ہے

تم ہی گیسوؤں والو! چھاؤں لے کے آ جاؤ
زندگی کی راہوں پر، تیز دھوپ چھائی ہے

کاش دولتِ غم ہی، اپنے پاس بچ رہتی
وہ بھی ان کو دے بیٹھے، ایسی مات کھائی ہے

آپ روئے کیوں آخر؟ سن کے قصّہ منظور
آپ کی بتائیں تو، آنکھ کیوں بھر آئی ہے

*

اَلحمدُللہ

۱۹۷۹ء تمام شُد

خدا کا شکر بجا لائیں اور عرض کریں
ترا کرم ہے کہ یہ سال بھی تمام ہوا

یہ خانہ زادِ حوادث یہ کشت و خون کا سال
جو تشنہ لب تھا اگر تشنگی مٹانے کو
عناد و بغض کے جام و سبو میں شام و سحر
بجائے بادۂ احمر ہماری شہ رگ کا
لہو نچوڑ کے پیتا تھا اور مچلتا تھا
کہیں پہ آگ کہیں پر دھواں اُگلتا تھا

خُدا کا شُکر بجا لائیں اور عرض کریں
ترا کرم ہے کہ یہ سال بھی تمام ہُوا

یہ بے حیا، یہ نکمّا، یہ بدخصال برس
جو سر پہ اپنے بٹھا کر سیاہ کاروں کو
اور آستیں میں لئے انتقام کا خنجر
شریف زادوں کی پگڑی اُچھالنے کیلئے
طرح طرح کی نقابیں لگا کے چلتا تھا
ہزار طرح کے بہروپ یہ بدلتا تھا

خدا کا شکر بجا لائیں اور عرض کریں
ترا کرم ہے کہ یہ سال بھی تمام ہوا

یہ مقتلوں کا، صلیبوں کا طوق و دار کا سال
اُبھرتے ڈوبتے لمحات میں چھپائے ہوئے
مبالغوں کے رسن، نازشوں کی زنجیریں
شکستہ خواب، نہ ہوں جن کی کوئی تعبیریں

طلسم وہم و گماں کے طفیل چلتا تھا
چراغ اس کا نہ بجھتا تھا اور نہ جلتا تھا

خدا کا شکر بجا لائیں اور عرض کریں!
ترا کرم ہے کہ یہ سال بھی تمام ہوا

*

دِل کا ہر قطرۂ خوں رنگِ حِنا سے مانگو
خوں بہا دوستو! قاتِل کی ادا سے مانگو

مت بناؤ یدِ بیضا کو گدا کا کشکول
وقتِ فرعون ہو جب ضربِ عصا سے مانگو

جب برسنے سے بڑھے تشنہ لبی کا احساس
یورشِ برق ہی ساون کی گھٹا سے مانگو

کب تلک شاخِ وفا لائے گی زخموں کے گلاب
کوئی تاثیر نئی آب و ہوا سے مانگو

موم کی طرح پگھل جائے گا شب کا فولاد
دستِ داؤد کی توفیق خدا سے مانگو

❋

پھر جنوں نامعتبر ہے، پھر خرد مشکل میں ہے
کاروانِ علم و دانش، جانے کس منزل میں ہے

مَیں نے کشتی چھوڑ دی طوفاں کی زد پر دوستو
تم بتاؤ امن کتنا دامنِ ساحل میں ہے

ہر نفس اُن کا تصوّر، ہر قدم اُن کا خیال
لُطف منزل میں کہاں، جو جادۂ منزل میں ہے

محملِ ظُلمت کے تارو، یہ بھی سوچا ہے کبھی
کاروانِ لیلیٰ شب، صبح کی منزل میں ہے

*

نہ خوفِ برق، نہ خوفِ شرر لگے ہے مجھے
خود اپنے باغ کے پھولوں سے ڈر لگے ہے مجھے

عجیب درد کا رِشتہ ہے ساری دُنیا میں
کہیں ہو جلتا مکاں اپنا گھر لگے ہے مجھے

میں ایک جام ہوں، کِس کِس کے ہونٹ تک پہنچوں
غضب کی پیاس لئے ہر بشر لگے ہے مجھے

تراش لیتا ہوں اُس سے بھی آئینے منظور
کِسی کے ہاتھ کا پتھّر اگر لگے ہے مجھے

*

✽

اَب خون کو مَے، قلب کو پیمانہ کہا جائے
اِس دَور میں مقتل کو بھی میخانہ کہا جائے

جو بات کہی جائے وہ تیور سے کہی جائے
جو شعر کہا جائے حریفانہ کہا جائے

ہر ہونٹ کو مرجھایا ہوا پھول سمجھیے
ہر آنکھ کو چھلکا ہوا پیمانہ کہا جائے

سنسان ہوئے جاتے ہیں خوابوں کے جزیرے
خوابوں کے جزیروں کو بھی ویرانہ کہا جائے

واعظ نے جو فرمایا تھا محرابِ حرم میں
رندوں سے وہ کیوں ساقی میخانہ کہا جائے

تپتے ہوئے صحرا میں بھی کچھ پھول کھلائیں
کب تک لب و رخسار کا افسانہ کہا جائے

ہم صبحِ بہاراں کی تمازت سے جلے ہیں
ہم سے گل و شبنم کا نہ افسانہ کہا جائے

دیوانہ ہر اک حال میں دیوانہ رہے گا
فرزانہ کہا جائے کہ دیوانہ کہا جائے

مخدومؔ سے ہم کو بھی ہے نسبت وہی منظور
رندوں میں جیسے نسبتِ پیمانہ کہا جائے

لہ مخدوم محی الدین

*

غمِ جاناں جو نہیں ہے، غمِ دوراں ہے بہت
زندگی تیرا ہر اک رنگ میں احساں ہے بہت

ایک قطرہ بھی لہو کا نہ مژہ پر چمکا
غم کا افسانہ ابھی تشنۂ عنواں ہے بہت

کون سلجھائے گا اب گیسوئے جاناں دیکھیں
آج کے دور کا انسان پریشاں ہے بہت

اے مرے دستِ جنوں، تیری تسلّی کے لئے
اُن کا دامن جو نہیں اپنا گریباں ہے بہت

کون بتلائے یہ شعلے پرِ پروانہ کے ہیں
لوگ کہتے ہیں کہ محفل میں چراغاں ہے بہت

علاجِ زخمِ دل ہوتا ہے غم خواری بھی ہوتی ہے
مگر مقتل کی میرے خوں سے گُل کاری بھی ہوتی ہے

وہی قاتل، وہی منصف، عدالت اُس کی، وہ شاہد
بہت سے فیصلوں میں اب طرفداری بھی ہوتی ہے

یہ ہے طرفہ تماشا کربلائے عصرِ حاضر کا
گھروں میں قاتلوں کے اب عزاداری بھی ہوتی ہے

تعلق اُن سے ٹوٹا تھا، نہ ٹوٹا ہے، نہ ٹوٹے گا
بہت مضبوط زنجیرِ وفاداری بھی ہوتی ہے

وہ میرا دوست ہے منظور لیکن جب بھی ملتا ہے
خلوصِ دل میں شامل کچھ ریاکاری بھی ہوتی ہے

یاد تمہاری آئی

چاند میں دیکھا تیرا چہرہ، پھول میں تیرا رُوپ
شمع جلی ہے تو پھیلی ہے تیرے بدن کی دھوپ
میٹھا درد جگا دیتی ہے، کوئل کی ہر کوک!
ساون ساون چوٹ لگی ہے، جیٹھ جیٹھ پُروائی
یاد تمہاری آئی ساجن جب بھی گھٹا لہرائی

سُونا سُونا سارا نگر ہے اُجڑا اُجڑا آنگن
صرف تمہارا عکس دکھائے دِل کا ٹوٹا درپن
شام کی زُلفیں جب بکھری ہیں اور بڑھی ہے اُلجھن

اُجلے اُجلے ہنس اُڑاتی صبح کبھی جو آئی
یاد تمہاری آئی ساجن جب بھی گھٹا لہرائی!

گیت جو لکھوں تیرا چہرہ آنکھوں میں میری اُبھرے
اِک اِک لفظ کے اندر تیرے نین کا کاجل بکھرے
جیون کے ہر جلتے پنتھ پر تیرے سائے گھیرے

میری اِک اِک سانس کے اندر تو لیتی انگڑائی
یاد تمہاری آئی ساجن جب بھی گھٹا لہرائی

*

پسِ نقابِ ضیائے بدن کی بات کرو
اسیرِ شب کسی صبحِ چمن کی بات کرو

شبِ الم میں جو چمکے مژہ پہ دل کا لہو
کفِ حسیں پہ حنا کی پھبن کی بات کرو

حریمِ حسن میں جب ہو طلسمِ قامت و زلف
دیارِ عشق میں دار و رسن کی بات کرو

زمانہ چال چلا ہے مرے سجن کی سی
جو ہو سکے تو سجن کے چلن کی بات کرو

حریفِ گردشِ دوراں ہے جس کا عہدِ وفا
اسی حسین اسی پیماں شکن کی بات کرو

ستائے یاد جو سلمائے حسن کی منظور
بہت کرو بھی تو شعر و سخن کی بات کرو

*

اِستعاروں میں بہاروں کو بُرا کہتے رہے
پھُول ہر زخم کو، آہوں کو صبا کہتے رہے

اپنے شانوں پہ لئے پھرتے رہے اپنی صلیب
اَپنے ہی خون کو ہم رنگِ حنا کہتے رہے

کس قدر پاسِ روایت ہے کہ ہم اہلِ سخن
اس تمازت پہ بھی زلفوں کو گھٹا کہتے رہے

جب پڑا وقت تو پھر سنگِ ملامت نکلے
تھے وہ پتھّر کے صنم، جن کو خُدا کہتے رہے

خلوتِ حسُن میں جل اُٹھّیں ہوس کی شمعیں
ہم لبِ عشق سے رُودادِ وفا کہتے رہے

*

رُخ پہ احباب کے پھر رنگِ مسرّت آئے
پھر مری سمت کوئی سنگِ ملامت آئے

تیری رحمت کا بھرم ٹوٹ رہا ہے شاید
آج آنکھوں میں مری اشکِ ندامت آئے

وَقت شاہد ہے کہ ہر دَور میں عیسیٰؑ کی طرح
ہم صلیبوں پہ لئے اپنی صداقت آئے

حُسن ہے اُن میں ترا میرے جنوں کا اَنداز
پھول بھی لے کے عجب شکل و شباہت آئے

دَورِ عشرت نے سنوارے ہیں غزل کے گیسو
فِکر کے پہلو مگر غم کی بدولت آئے

حسینؓ

طلسمِ سود و زیاں ہو کہ ظلمتِ باطل
فصیلِ دار و رسن ہو کہ کوچۂ قاتل
دیارِ ظلم و ستم ہو کہ صید گاہِ رقیب
کوئی جادۂ پُر خار ہو کہ شہرِ صلیب

رہِ حیات میں جب یہ مقام آتے ہیں!
حسینؓ سارے زمانے کے کام آتے ہیں!

نمودِ صبحِ ازل سے حدودِ امکاں تک
فرات و نیل کے ساحل سے چاہِ کنعاں تک
ستیزہ کار رہا ہے ہر ایک خیر سے شر
چراغِ مصطفویؐ سے ابولہب کا شرر

رہِ خلیلؑ میں اصنامِ آذری بھی ہیں
کلیمؑ ہیں تو طلسماتِ سامری بھی ہیں

مگر حریمِ زلیخا و مصر کے بازار
صلیب و آتش و زہراب نینوا کے دیار
بجھا سکے نہ کبھی شمعِ عصمتِ کردار
دبا سکے نہ کبھی حق کی جرأتِ گفتار

جہانِ خیر میں دریائے فیض جاری ہے
بدی نے مورچے جیتے ہیں جنگ ہاری ہے"

جلا کے مشعلِ جاں روشنی عطا کی ہے
نمازِ سایۂ شمشیر میں ادا کی ہے
بساطِ شوق پہ تابندہ کہکشاں رکھ دی
دہانِ زخم میں اللہ کی زباں رکھ دی

امینِ فاتحِ بدر و حنین زندہ باد
سلام خونِ شہیداں حسینؓ زندہ باد

❋

خرد مذاقِ جنوں پھر سے اختیار کرے
غمِ حیات کو صرفِ نگاہِ یار کرے

خوشا وہ قطرۂ خوں جو گِر کے پلکوں سے
کسی کے پائے حنائی کو تابدار کرے

جلائیں دل کہ سمٹ جائے تیرگی شب کی
نہ جانے کب ہو سحر کون اِنتظار کرے

اُٹھائیں جام سجائیں نگار خانۂ دل
یہاں تلک کوئی زخمِ جگر شمار کرے

جنوں کی گردِ سفر ہیں ثوابت و سیّار
خِرد ابھی مہ و خورشید کا شکار کرے

یہ چاہتا ہوں کہ اَب کی بہار کا موسم
مجھے نہیں تو خُدا تم کو سازگار کرے

*

✻

خواب کا رشتہ حقیقت سے نہ جوڑا جائے
آئینہ ہے اسے پتھّر سے نہ توڑا جائے

اب بھی بھر سکتے ہیں میخانے کے سب جام و سبو
میرا بھیگا ہُوا دامن جو نچوڑا جائے

ہر قدم مرحلۂ مرگِ تمنّا ہے مگر
زندگی پھر بھی ترا ساتھ نہ چھوڑا جائے

آؤ پھر آج کریدیں دلِ افسردہ کی راکھ
آنسوؤں ہوئی یادوں کو جھنجھوڑا جائے

ہو وہ توبہ، کہ ہو ساغر، کہ ہو پیمانِ وفا
کچھ نہ کچھ آج تو میخانے میں توڑا جائے

زُلف و رُخ آج بھی عنوانِ غزل ہیں منظور
رُخ ادھر گردشِ ایّام کا موڑا جائے

قطعہ لہو کی بوند کوئی اَب تک نہ مری بیکار گری
یا رنگِ حنا بن کر چمکی یا پیشِ صلیب و دار گری

اَوروں پہ نہ جانے کیا گذری اِس تیغ و تبر کے موسم میں
ہم سَر تو بچا لائے لیکن دستارِ سرِ بازار گری

جو تیر اندھیرے سے تھے چلے، وہ سرحدِ جاں کو چھو نہ سکے
چلتا تھا میں جس کے سائے میں گردن پہ وہی تلوار گری

کیا جانے کیسی تھی وہ ہوا، چونکا نہ شجر پتّہ نہ ہلا
بیٹھا تھا میں جس کے سائے میں منظور وہی دیوار گری

مرا ہی پُرسکوں چہرا بہت تھا
مَیں اپنے آپ میں بکھرا بہت تھا

بہت تھی تشنگی، دریا بہت تھا
سرابوں سے ڈھکا صحرا بہت تھا

سلامت تھا وہاں بھی میرا داماں
بہاروں کا جہاں چرچا بہت تھا

اُنھیں ٹھہرے سمندر نے ڈبویا
جنھیں طوفاں کا اندازا بہت تھا

اُڑاتا خاک کیا میں دشت و در کی
مِرے اندر مِرا صحرا بہت تھا

زمیں قدموں تلے ہیچی بہت تھی
سَروں پر آسماں اُونچا بہت تھا

❋

ایک رقص

جسم پر تارِ گریباں بھی نہیں
ہاتھ میں پرزۂ داماں بھی نہیں
یعنی شاید
جنونِ معتبر ہے اس زمانے کا
بہار آئی
تو پرزے اُڑ گئے جیب و گریباں کے

٭

تعمیرِ زیست فکر کا عنواں ہوئی تو ہے
اب کچھ تلافیٔ غمِ دوراں ہوئی تو ہے

کلیاں یقیں کی، عزم کی خوشبو، عمل کے پھول
آرائشِ عروسِ بہاراں ہوئی تو ہے

کچھ اور تیز گام رفیقانِ راہِ شوق !
اِک روشنی افق پہ نمایاں ہوئی تو ہے

منظور بادِ فصلِ بہاراں سے اَب خزاں
کھا کر شکست چاکِ گریباں ہوئی تو ہے

*

جب ترا غم مری پلکوں پہ سنور جاتا ہے
چہرۂ گردشِ ایّام اُتر جاتا ہے

تیری پاکیزہ نگاہی کا تصرّف تو بہ
درد کا کوئی بھی لمحہ ہو گزر جاتا ہے

مانعِ دید نہیں، تابشِ رخسارِ جمال
عشق خود شدّتِ جذبات سے ڈر جاتا ہے

جب سے میخانے کا بدلا ہے پرانا دستور
لے کے خود پیرِ مغاں شیخ کے گھر جاتا ہے

سوچ کر قتل گہہِ خواب میں انجامِ طرب
نشّۂ بادۂ گل رنگ اتر جاتا ہے

زندگی کتنی ہے وابستۂ نیرنگِ جمال
وہ سنورتے ہیں تو احساس سنور جاتا ہے

*

دشنۂ ابرو، خنجرِ مژگاں، کل بھی تھا اور آج بھی ہے
خون سے رنگیں دامنِ جاناں کل بھی تھا اور آج بھی ہے

بستی بستی ظلم فراواں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
امن و سکوں اک خوابِ پریشاں کل بھی تھا اور آج بھی ہے

اہلِ ہوس میں جشنِ بہاراں، کل بھی تھا اور آج بھی ہے
اہلِ وفا کا چاکِ گریباں، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

محفل محفل دار کا چرچا، مجلس مجلس ذکرِ رسن
مقتل مقتل خونِ شہیداں، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

*

*

دیدۂ عبرت سے پہلے تم مجھے دیکھا کرو
دوستو پھر اُس نگاہِ ناز کا چرچا کرو

بن گیا اہلِ ہوس کا چاک دامانی شعار
اہلِ غم اپنے گریباں سی کے اب نکلا کرو

چاند کی ساری حقیقت ہو چکی ہے آئینہ
اِنتقاماً اَب مزاجِ مہ وشاں پوچھا کرو

دیکھنے والو جمالِ نقش ہائے رنگ رنگ
آئینہ میں شکل بھی اپنی کبھی دیکھا کرو

تا رہے باقی متاعِ سوز و سازِ زندگی
عاشقی میں اِک رقیبِ رُوسیہ پیدا کرو

گُل گریباں چاک، غنچے مضمحل، بلبل اُداس
ایسی تعبیروں سے اَپنے خواب مت رُسوا کرو

آج ہر لمحے کے ہاتھوں میں ہے سنگِ بے حسی
اَپنا غم کہنے سے پہلے دیر تک سوچا کرو

تشنگی اتنی بڑھی ہے جل رہے ہیں سب کے ہونٹ
اِحتراماً چپ رہو منظور مت بولا کرو!

قومی ترانہ

بچوّں کیلئے

جیون کی اندھیری راہوں پر ہم دیپ جلایا کرتے ہیں
آکاش کے جھلمل تاروں پر نظریں بھی اُٹھایا کرتے ہیں
آدرش کے پھولوں کی خاطر کانٹوں میں گذارا کرتے ہیں
دُنیا کو سُکھی رکھنے کے لئے دُکھ درد گوارا کرتے ہیں
جب آنچ وطن پر آتی ہے تلوار اُٹھایا کرتے ہیں

کشمیر کی نرمل جھیلیں تو درپن ہیں ہمارے ارماں کا
لدّاخ کی اُونچی چوٹی پر سایہ ہے ہمارے داماں کا
نیفا کی زمیں کا کیا کہنا، ٹکڑا ہے ہماری ہی جاں کا
ہے ان کی حفاظت فرض ہمیں یہ بھی ہے تقاضا ایماں کا
جب آنچ وطن پر آتی ہے تلوار اُٹھایا کرتے ہیں

بنگال کی بکھری زُلفوں کو آئینہ دکھایا ہے ہم نے
دُکھ درد کی ماری جنتا کو سینے سے لگایا ہے ہم نے
بَن باس مِلا تھا گھر سے انہیں اور راج دِلایا ہے ہم نے
جو قرض کسی کے اُوپر تھا وہ قرض چُکایا ہے ہم نے
جب آنچ وطن پر آتی ہے تلوار اُٹھایا کرتے ہیں

تاریخ بتائے گی تم کو تہذیب سکھائی ہے کس نے
ست دھرم واہنسا کی پوری تفسیر بتائی ہے کس نے
اس رنگ رنگیلی دُنیا کی تنویر بڑھائی ہے کس نے
ہر خواب محبت کی آخر، تعبیر بتائی ہے کس نے
جب آنچ وطن پر آتی ہے تلوار اُٹھایا کرتے ہیں

گیتا سے سبق بھی لیتے ہیں، قرآں کی زباں بھی رکھتے ہیں
گوتم کی صدا، نانک کی کتھا، چشتی کی اذاں بھی رکھتے ہیں
ٹیپو کا علم بھی ہاتھ میں ہے، ارجن کی کماں بھی رکھتے ہیں
منظور بتا دو دُنیا کو ہم عزم جواں بھی رکھتے ہیں
جب آنچ وطن پر آتی ہے تلوار اُٹھایا کرتے ہیں

*

ترکِ محبّت اپنی خطا ہو، ایسا بھی ہو سکتا ہے
وہ اَب بھی پابندِ وفا ہو، ایسا بھی ہو سکتا ہے

دروازے پر آہٹ سُن کر، اُسکی طرف کیوں دھیان گیا
آنے والی صرف ہوا ہو، ایسا بھی ہو سکتا ہے

حالِ پریشاں سُن کر میرا، آنکھ میں اس کی آنسو ہیں
میں نے اس سے جھوٹ کہا ہو، ایسا بھی ہو سکتا ہے

عرضِ طلب پر اُس کی چُپ سے ظاہر ہے اِنکار مگر!
شاید وہ کچھ سوچ رہا ہو، ایسا بھی ہو سکتا ہے

حدِّ نظر تک صرف دُھواں تھا، برق پہ کیوں الزام رکھیں
آتشِ گُل سے باغ جلا ہو، ایسا بھی ہو سکتا ہے

خون بہانا اس کا شیوہ ہے تو یہی منظور، مگر!
ہاتھ پہ اس کے رنگِ حنا ہو، ایسا بھی ہو سکتا ہے

*

تشنہ لبی نے جب بھی ذوقِ عمل دیا ہے
رِندوں نے میکدے کا ساقی بدل دیا ہے

دُنیا ہے اس کی شاہد اس شہرِ بے اماں نے
جس میں انا سمائی وہ سر کچل دیا ہے

کھلتے رہے ہیں جو گُل، بادِ خزاں کی شہ پر
دستِ صبا نے بڑھ کر اُن کو مسل دیا ہے

سب نے سُنی ہے جس میں عصرِ رواں کی دھڑکن
مظہر نے ایسا سازِ غزل دیا ہے

*

ایسی تڑپ عطا ہو کہ دُنیا مثال دے
اِک موجِ تہ نشیں ہوں مجھے بھی اُچھال دے

بے چہرگی کی بھیڑ میں گم ہے مِرا وجُود
مَیں خود کو ڈھونڈھتا ہوں مجھے خدّوخال دے

ہر لحظہ بنتے ٹوٹتے رِشتے نہ ہوں جہاں
پچھلی رفاقتوں کے وہی ماہ و سال دے

کشکولِ ذات لے کے نہ جاؤں میں دربدر
حاجت روا ہو سب کا وہ دستِ سوال دے

اس دشتِ پُرسراب میں بھٹکوں کہاں کہاں
زنجیرِ آگہی مرے پیروں میں ڈال دے

منظور کا یہ ظرف کہ کچھ مانگتا نہیں
مرضی تری، جو چاہے اُسے ذوالجلال دے

*

ایک دُعا

یہ کالی کالی گھٹاؤں میں ماہتاب کی ضَو
رُخِ حبیب سلامت، بخیرِ زُلفِ دراز
اُفق پہ آنکھ مچولی میں منہمک انجُم
عروسِ نَو تری اَفشاں کی مُنتشر تنویر

کہ جگنوؤں کے دیے جھلملا کے رہ جائیں
زہے نصیبِ حنا بستہ مٹھیوں کا طلسم
فضائے نور میں کیوپڈ کے نقرئی شہپر
سلام خنجرِ مژگاں، سلام ابروئے دوست
صباحتوں کے جلو میں سیاہ تل کی دمک
کہ جیسے دودھ نہلاؤں میں کائنات کا دل
کنول سی آنکھ میں کاجل کی شوخ تحریریں
خمِ شراب میں جیسے ہو عکسِ دار و رسن
جھلستی تپتی ہوئی کائنات کے رُخ پر
ترا وجود ہے ساون کی دل فریب گھٹا
دُعا مری ہے کہ آنچل کے تیرے سایہ میں
غمِ حیات کے ماروں کو نیند آ جائے
جھلستی تپتی ہوئی کائنات کے رُخ پر
سکوں نواز تری زُلف پھول برسائے

٭

زندگی میں پہلے اتنی تو پریشانی نہ تھی
تنگ دامانی تھی لیکن چاک دامانی نہ تھی

جام خالی تھے مگر میخانہ تو آباد تھا
چشمِ ساقی میں تغافل تھا پشیمانی نہ تھی

غازۂ غم ایک تھا، تھے سب کے چہرے مختلف
غور سے دیکھا تو کوئی شکل انجانی نہ تھی

جن سفینوں نے کبھی توڑا تھا موجوں کا غرور
اُس جگہ ڈوبے جہاں دریا میں طغیانی نہ تھی

تجھ سے اُمیدِ وفا خوابِ پریشاں تو نہ تھی
بے وفا عمرِ گریزاں تھی کہ طولانی نہ تھی

پڑھ چکا اپنی غزل منظورؔ تو ایسا لگا
مرثیہ تھا دَورِ حاضر کا، غزل خوانی نہ تھی

*

ضیائے صبح بھی ہے دامنِ صبا بھی ہے
سوال یہ ہے کہ غنچہ کوئی کِھلا بھی ہے

تمازتِ غمِ دَوراں سے وہ بھی بچ نہ سکے
کہ جن کے شانوں پہ زُلفوں کی اِک گھٹا بھی ہے

وداعِ ہوش ہی عنوانِ فصلِ گُل تو نہیں
چمن میں چاک گلوں کی حسیں قبا بھی ہے

اس التفاتِ فراواں کو کیا کہوں منظور!
نگاہِ لُطف بھی ہے نشترِ حیا بھی ہے

*

چہرے پہ سارے شہر کے گردِ ملال ہے
جو دل کا حال ہے، وہی دِلّی کا حال ہے

اُلجھن، گھٹن، ہراس، تپش، کرب، انتشار
وہ بھیڑ ہے کہ سانس بھی لینا محال ہے

آوارگی کا حق ہے ہواؤں کو شہر میں
گھر سے چراغ لے کے نکلنا محال ہے

بے چہرگی کی بھیڑ میں گُم ہے ہر اک وجُود
آئینہ پُوچھتا ہے کہاں خدّ و خال ہے

جن میں یہ وصف ہو کہ چھُپا لیں ہر ایک داغ
اُن آئینوں کی آج بڑی دیکھ بھال ہے

پرچھائیاں قدوں سے بھی آگے نکل گئیں
سُورج کے ڈُوب جانے کا اَب احتمال ہے

کشکولِ چشم لے کے پھرو تم نہ دربدر!
منظور قحطِ جنسِ وفا کا یہ سال ہے

*

یاد کے جگنو

یاد کے جگنو جگمگ کرتے دل کے دوار تک آئے

جگوں کی پیاسی دھرتی پر بھی آج ہوئی برسات

آشا کی سوکھی ڈالی پر پھوٹنے لگے ہیں پات

چاندی جیسی صبح ہوئی ہے سونے جیسی رات

برہ سے کہہ دو اپنا چہرہ اب نہ ہمیں دکھلائے

یاد کے جگنو جگمگ کرتے دل کے دوار تک آئے

چاروں طرف ہے پھیلی خوشبو تیز ہے دل کی دھڑکن
نیل گگن کا اِک اِک تارا، آج ہے کتنا روشن
وادی وادی پھول کھلے ہیں مہکا مہکا اُپون

زُلف گھنیرے بادل جُھک کاۓ کون یہ چھب دکھلاۓ
یاد کے جگنو جگمگ کرتے دل کے دوار تک آۓ

رُوپ تمہارا دیکھ کے چندا بادل میں چھپ جاۓ
آنکھ تمہاری دیکھ کے ہرنی جنگل میں چکراۓ
چال تمہاری ایسی نیاری جگ جگ دیپ جلاۓ

خواب میں آنے والا ساجن، کاش کبھی آ جاۓ
یاد کے جگنو جگمگ کرتے دل کے دوار تک آۓ

*

صحیفۂ نو، برنگِ قول و قرار اُترا تو میں نے دیکھا
فریبِ وعدہ وہی تھا جو بار بار اُترا تو میں نے دیکھا

تمام جھوٹی تسلّیوں کی جو تھیں تو بے رنگ سلوٹیں تھیں
جب اس کے چہرے سے غازۂ اعتبار اُترا تو میں نے دیکھا

تمام شاخیں جلی ہوئی تھیں تمام غنچے دہک رہے تھے
مرے گلستاں میں کاروانِ بہار اُترا تو میں نے دیکھا

تمام میکش تھے پیاسے پیاسے بس ایک ساقی بہک رہا تھا
شبِ گذشتہ کا صبحدم جو خمار اترا تو میں نے دیکھا

مرے فریبِ نظر نے اس کو بلند قامت بنا دیا تھا
وہ اتفاقاً جو بام سے ایک بار اُترا تو میں نے دیکھا

مُصیبتوں کا نیا سمندر مری نگاہوں کے سامنے تھا
مرا سفینہ جو اک سمندر کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

*

رِندِ کم ظرف کو ساقی بھی سزا دیتا ہے
مے چھلکتی ہے تو محفل سے اُٹھا دیتا ہے

چارہ گر خُوب سمجھتا ہے کہ کِن زخموں کو
کوئی مرہم نہیں نشتر ہی شفا دیتا ہے

یہ کہیں قافلۂ صبحِ بہاراں تو نہیں
کون آکر درِ زنداں پہ صدا دیتا ہے

میکدہ کا اسی ساقی سے بھرم ہے منظورؔ
تشنہ لب رہ کے جو اوروں کو پلا دیتا ہے

*

معمول پہ ساحل رہتا ہے فطرت پہ سمندر ہوتا ہے
طوفاں جو ڈبو دے کشتی کو کشتی ہی کے اندر ہوتا ہے

جو فصلِ خزاں میں کانٹوں پر رقصاں و غزلخواں گذرے تھے
وہ موسمِ گل میں بھول گئے، پھولوں میں بھی خنجر ہوتا ہے

ہر شام چراغاں ہوتا ہے اشکوں سے ہماری پلکوں پر
ہر صبح ہماری بستی میں جلتا ہوا منظر ہوتا ہے

اب دیکھ کے اپنی صورت کو اک چوٹ سی دل پر لگتی ہے
گزرے ہوئے لمحے کہتے ہیں آئینہ بھی پتھر ہوتا ہے

اس شہرِ ستم میں پہلے تو منظور بہت سے قاتل تھے
اب قاتل خود ہی مسیحا ہے یہ ذکر برابر ہوتا ہے

✻

مقتلِ مقتل اہلِ ستم کا حوصلۂ دل دیکھا ہے
ہم نے فرازِ دار سے اکثر کوچۂ قاتل دیکھا ہے

صحرا، زنداں، طوق، سلاسل، آتش، زہر اور دار و رسن
دُنیا نے تاریخِ وفا کا بس یہی حاصل دیکھا ہے

سُرخیٔ لب کے، رنگِ قبا کے، نقشِ حنا کے خواب نہ پُوچھ
وقتِ سحر تعبیر میں ہم نے خونِ رگِ دل دیکھا ہے

مجھ کو یہ ڈر ہے ٹوٹ نہ جائے آج غرورِ حسن و جمال
اُس نے مرے آئینۂ دل کو اپنے مقابل دیکھا ہے

زنداں زنداں شورِ سلاسل، گلشن گلشن شورشِ گُل
اَب کے برس منظورؔ نے طوفاں ساحل ساحل دیکھا ہے

*

شیشہ و تیشہ

ہزاروں بار اس کمبخت دل پر آفتیں آئیں
ہزاروں بار اس کمبخت دل نے ٹھوکریں کھائیں
ہزاروں بار ٹوٹا بے رُخیٔ چشمِ خوباں سے
کبھی احباب سے شاکی
کبھی غیروں کا وارفتہ
کبھی چاکِ قبائے گُل پہ آنسو خون کے رویا
کبھی خارِ مغیلاں پر اسے راحت کی نیند آئی
کبھی شیشہ کبھی تیشہ عجب انداز والا ہے
ہمارا دِل بھی یارب جانے کس آفت کا پالا ہے

بہشتِ گُم شُدہ میں لے گیا ملٹن کبھی اس کو
کبھی دوزخ میں پہنچا ڈانٹے کا ہم سفر ہو کر
کبھی ھومر سے باتیں ہیں
کبھی ورجل سے سرگوشی!
کبھی سنگ و خذف ریزوں پہ نیّت خام کر بیٹھا
کبھی یہ حافظِ شیراز بن کر
"بخالِ ہندوش بخشد سمرقند و بخارا را"
رقیبوں سے لڑا ہے یہ بھی پشکن کی محبّت میں
کبھی خیّام کا پیالہ
کبھی بچّن کا مدھوشالہ
کبھی یہ کیٹس کا بُلبُل
کبھی اقبال کا شاہیں
رفیقِ گولڈ اسمتھ بن کے یہ یورپ میں گھوما ہے
کبھی یہ بائرن بن کر حسیں باہوں میں جھوما ہے

شہیدِ عارض و پیکر
قد و گیسو کا متوالا!
کبھی سنسان رہتا ہے
کبھی ویران رہتا ہے
کبھی آغوش میں اس کے
کوئی سلمیٰ، کوئی عذرا، کوئی ریحانہ رہتی ہے
ستارے رازداں اس کے
فرشتے ہم زباں اس کے
کبھی بامِ ثریا پر
کبھی قعرِ مذلت میں
کبھی خورشید سے باتیں
کبھی ناہید سے گھاتیں
کبھی مجروح ہوتا ہے
کبھی مصلوب ہوتا ہے

مشیت نے نہ جانے کس لئے دل کو بنایا ہے
کبھی ہے روشنی اس میں کبھی دیکھا تو سایا ہے

*

شکوہ مرا شرمندۂ احساں سا لگے ہے
جب تیرا تغافل بھی پشیماں سا لگے ہے

اب برق کا کیا ذکر کہ خود شعلۂ گُل سے
جلتا ہے نشیمن تو چراغاں سا لگے ہے

تعبیر کو کیا روئیں کہ اس دورِ خرد میں
جو خواب ہے وہ خوابِ پریشاں سا لگے ہے

اس طرح سے آئی ہے بہار اپنے چمن میں
گلچیں ہے کہ گُل چاک گریباں سا لگے ہے

آئینۂ مہتاب میں ہنستا ہوا چہرہ
آئینۂ ایّام میں حیراں سا لگے ہے

❋

دوستو! اس راز سے ساقی ہے تنہا آشنا
آج کیوں ہیں تشنہ لب، کل تھے جو صہبا آشنا

شاہراہِ زیست پر ہم نے جلائے ہیں چراغ
ہم کہ تھے ہر دور میں امروز و فردا آشنا

بہ گئے اغراض کی لہروں میں تنکوں کی طرح
اہلِ ساحل کی نظر میں تھے جو دریا آشنا

شکوۂ بے مہریٔ احباب کرنا ہے فضول
کون کِس کا دوست ہے یاں، کون کِس کا آشنا

کر سکیں جس پر بھروسا ایک بھی ایسا نہیں!
یوں تو ہیں منظور یاں اپنے بھی صدہا آشنا

کوائف

نام ________ ملک زادہ منظور احمد

والد کا نام ________ ملک محمود احمد (مرحوم)

پیدائش ________ ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۹ء موضع وڈاکخانہ بھدمنٹر ضلع فیض آباد

تعلیم ________ ایم اے (تاریخ) ایم اے (انگریزی)
ایم اے پی ایچ ڈی (اردو)

پتہ ________ سی - ۱۳۳۹ - اندرانگر لکھنؤ

تصانیف

* اردو کا مسئلہ * کالج گرل * شہرِ سخن * ابوالکلام آزاد ___ فکروفن * غبارِ خاطر کا تنقیدی م

* مولانا آزاد ___ الہلال کے آئینے میں * انتخاب غزلیاتِ نظیر اکبر آبادی

زیر ترتیب

• رقص شرر (خود نوشت)

• اندھیری رات کے جگنو (معاصر شعرا کا تذکرہ)

شراب

رقصِ شرر
• داستان ہے اُس شخص کی جو زندگی کے بیکراں سمندر کے مدوجزر میں شامل رہا ہے، • کہانی ہے اُس انسان کی جو ادبی اور لسانی تحریکوں کا ایک حصہ رہا ہے • منظر نامہ ہے اُن مشاعروں کا جس پر اُس نے آزادی کے بعد سے اب تک جادو جگایا ہے • سفر نامہ ہے اُس ادبی آوارہ گرد کا، جو اُردو دُنیا کے مختلف ممالک میں مدعو کیا گیا ہے • آئینہ خانہ ہے اُن کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جن میں اُس نے معلمی کی ہے • رزمیہ ہے اُس خوددار اور غیرت مند انسان کا جس نے حکومت کے عہدوں کو ٹھکرایا ہے • بیانیہ ہے اُس آدمی کا جس کو چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو رہی ہے • شہر آشوب ہے اُس عہد کا جس میں ہم آپ جی رہے ہیں • مرثیہ ہے اُس تہذیبی ورثہ کا جو رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے • قصیدہ ہے اُن اعلیٰ و ارفع اقدار کا جنہیں انسانیت نے ہر دور میں عزیز رکھا ہے • واسوخت ہے دورِ حاضر کی اس تنقید کا جس میں فن کار اپنی تخلیقات کے بجائے اپنی سماجی پوزیشن اور رسوخ سے پرکھا گیا ہے، • اور خود نوشت ہے معروف شاعر، ادیب، ناظمِ مشاعرہ اور اُردو تحریک کے رُوحِ رواں
پروفیسر ملک زادہ منظور احمد
کی، جنہیں آپ اچھی طرح سے جانتے اور پہچانتے ہیں، •
(زیر طبع)
شہرِ ادب
سی۔ ۱۳۳۹، اندرا نگر، لکھنؤ
فون: ۳۸۲۴۳۰
اعتراف
اگر یسین مومن (ایڈوکیٹ ہنڈی) کی تحریک اور انور ندیم (لکھنؤ) کی تائید نہ ہوتی تو یہ مسودہ ابھی شائع نہ ہوتا
اس بات کا بھی احساس ہے کہ مجھے شاہد وحید اور قاضی ممتاز علی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے
ملک زادہ منظور احمد